رسائل و مسائل

مشکوک آمدنی پر قطع تعلق؟

سوال: مرکز قومی بچت میں رقم لگانا کیسا ہے؟ طریق کار یہ ہے کہ لوگ اپنے پیسے جمع کراتے ہیں اور ایک لاکھ پر ۱۰۰۰/۱۱۰۰ روپے ماہانہ کے حساب سے منافع وصول کرتے ہیں اور رقم بھی محفوظ رہتی ہے۔

میرے کئی جاننے والے ہیں جنھوں نے اپنی رقم قومی بچت کے مرکز میں رکھی ہے۔ اکثر آسودہ حال ہیں۔ ذاتی مکان ہے، ۵۰ ہزار روپے ماہانہ پنشن بھی ملتی ہے۔ مکان کا ایک حصہ کرایے پر بھی دیا ہوا ہے، خرچ برائے نام ہے۔ میں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ کسی ایسے شخص کے گھر سے جس کی رقم مرکز قومی بچت میں لگی ہو اور مجھے پتا چل جائے تو میں اس کے گھر سے پانی پینا بھی اپنے لیے ناجائز سمجھتا ہوں، البتہ گھر والوں کو اس بارے میں منع نہیں کیا ہے اور کہا ہے کہ جو مہمان آئے اس کی مناسب خاطر تواضع کی جائے، البتہ وہ میرے گھر میں کوئی چیز نہ لائے۔

کیا میرا یہ فیصلہ درست ہے؟ دین اسلام کی روشنی میں ایسا کرنا کیسا ہے؟ کئی علما جواز کا بھی فتویٰ دیتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ جب حکومت دیتی ہے تو ہم کیوں نہ لیں؟ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ ایسا کرتے ہیں تو ہم کیوں نہ کریں؟ میری اُلجھن دور فرما دیں؟

جواب: کسی جمع شدہ رقم پر متعین مقدار میں منافع حاصل کرنا ربا (سود) ہے، جسے اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں سودی لین دین کرنے والوں کے خلاف اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے جنگ کا اعلان کیا گیا ہے۔ (البقرہ ۲:۲۷۸-۲۷۹)، اور حدیث میں ہے کہ سودی کاروبار کرنے والوں اور اس میں معاونت کرنے والوں، دونوں پر اللہ کے رسول صلی اللہ

علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے (مسلم: ۱۵۹۷، ۱۵۹۸)۔ اس لیے اصولی طور پر یہ بات طے شدہ ہے کہ سودی کاروبار اور اس میں ملوث افراد کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔

البتہ سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سودخوری کا ارتکاب کر رہا ہو تو کیا اس سے سماجی تعلقات رکھے جاسکتے ہیں؟ اس کی تقریبات میں شریک ہوا جاسکتا ہے؟ اس کی دعوت قبول کی جاسکتی ہے؟ اور اگر وہ کوئی تحفہ دے تو اسے قبول کیا جاسکتا ہے؟

اس کا فیصلہ کرتے وقت دین کی مجموعی تعلیمات اور شرعی مصلحت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک طرف اہل خاندان اور سماج میں رہنے والے دیگر افراد سے تعلقات رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان سے قطع تعلقی سے روکا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوے سے ہمیں یہی تعلیم ملتی ہے۔ آپؐ نے نہ صرف اپنے خاندان والوں، اور دیگر اہل ایمان سے خوش گوار تعلقات رکھے، بلکہ سماج کے دیگر غیر مسلم افراد اور غیر مسلم حکم رانوں سے بھی روابط رکھے، اور ان کے ساتھ تعلقات میں خوش گواری کے لیے انھیں ہدیے بھیجے اور ان کے ہدیے قبول کیے۔ دوسری طرف حرام مال اور حرام مشروبات سے احتراز کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے فقہا نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اگر کسی شخص کی کل آمدنی یا اس کا زیادہ تر حصہ سود پر مبنی ہو تو اس کی دعوت یا اس سے کوئی تحفہ قبول کرنا جائز نہیں، لیکن اگر ایسا نہ ہو اور اس کی زیادہ تر آمدنی حلال ذرائع سے ہو تو اس کی دعوت یا اس کا تحفہ قبول کرنے میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی سیکریٹری اسلامک فقہ اکیڈمی (بھارت) نے فتاویٰ عالمگیری کے حوالے سے لکھا ہے: ''اگر معلوم ہو کہ دعوت سودی پیسے سے کی جارہی ہے تب تو دعوت میں شریک ہونا قطعاً جائز نہیں ہے اور اگر دعوت کا حلال پیسے سے ہونا معلوم ہو تو دعوت میں شرکت جائز ہے، اور اگر متعین طور پر اس کا علم نہ ہو تو پھر اس بات کا اعتبار ہوگا کہ اس کی آمدنی کا غالب ذریعہ کیا ہے؟ اگر غالب حصہ حرام ہے تو دعوت میں شرکت درست نہیں اور غالب حصہ حلال ہے تو دعوت میں شرکت جائز ہے''۔ (کتاب الفتاویٰ، زمزم پبلشرز، کراچی، ج ۶، ص ۲۰۱، بہ حوالہ الفتاویٰ الہندیۃ: ج ۵، ص ۳۴۳)

علما یہ بھی کہتے ہیں کہ جو لوگ سودی کاروبار اور لین دین میں ملوث ہوں ان کی دعوتوں میں شرکت کرنے سے سماج کے سربرآوردہ لوگوں اور خاص طور پر علما کو احتراز کرنا چاہیے، تاکہ ایسے

لوگوں کی حوصلہ شکنی ہو اور دوسروں تک درست پیغام جائے۔

بہرحال اس معاملے میں دینی مصلحت اور شرعی تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اس کے مطابق جو بات مناسب لگے اس پر عمل کرنا چاہیے۔(مولانا ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی)

مطلقہ ماں کا حقِ حضانت (پرورش)

سوال: اخبار میں ایک استفسار کے جواب میں درج ہے: ''شرعاً والد کو یہ حق حاصل ہے، بلکہ اُس کے لیے ضروری ہے کہ اگر طلاق کی نوبت آئے تو اپنی ساری اولاد کو وہ اپنے پاس رکھے۔ والدہ کو اولاد رکھنے کا کوئی حق نہیں، مگر حدیث پاک میں آیا ہے کہ:

۱- ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ میرا بیٹا ہے، میرا بطن اس کی جاے قرار تھی۔ میرے سینے سے اس نے دودھ پیا اور میری آغوش نے اِسے پالا ہے۔ اب اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے اور چاہتا ہے کہ اسے مجھ سے چھین لے۔ آپؐ نے فرمایا: ''جب تک تو نکاح نہ کرے، تو اِس بچے کی زیادہ حق دار ہے''۔(مشکوٰۃ بلوغ الصغیر و حضانتہ)

۲- نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایک لڑکے کو اختیار دیا کہ وہ چاہے تو باپ کے پاس رہے اور چاہے تو ماں کے پاس۔(ایضاً)

۳- ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''میرا خاوند چاہتا ہے کہ میرے بیٹے کو لے جائے، حالاں کہ وہ [بچہ] مجھے پانی لا دیتا ہے اور میرے کام آتا ہے۔ آپؐ نے اس لڑکے سے فرمایا: ''یہ تمھارا باپ ہے اور یہ تمھاری ماں ہے، جس کا ہاتھ چاہو پکڑ لو''۔ اُس نے ماں کا ہاتھ تھام لیا اور وہ اُسے لے کر چلی گئی۔(ایضاً)

۴- حضرت ابوہریرہؓ کے پاس ایک فارسی عورت آئی، جس کے ساتھ اُس کا بیٹا تھا، اور جس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ میاں بیوی نے حضرت ابوہریرہؓ کے سامنے اپنے مقدمے کو پیش کیا۔ عورت نے اپنی زبان میں کہا: میرا خاوند، میرے بیٹے کو لے جانا چاہتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا: ''بچے کے بارے میں قرعہ ڈال لو''۔

خاوند نے آ کر کہا: ''میرے بیٹے کے بارے میں میرے استحقاق میں کون جھگڑا کرسکتا ہے''؟ حضرت ابوہریرہؓ نے جواب دیا: میں یہ بات صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا اور ایک عورت نے آ کر کہا: ''میرا خاوند میرے بیٹے کو لینا چاہتا ہے، حالاں کہ بچہ میرے کام کرتا ہے اور مجھے پانی لا دیتا ہے''۔ آپ نے فرمایا: ''دونوں میں قرعہ ڈال لو''۔ باپ نے کہا: ''میرے بیٹے کے بارے میں کون جھگڑا کرسکتا ہے''؟ آپؐ نے بچے سے فرمایا: ''یہ تمھارا باپ ہے اور یہ تمھاری ماں ہے، جس کا ہاتھ چاہو پکڑ لو''۔ اُس نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ (ایضاً)

۵- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے والدہ اور اُس کے بیٹے کے درمیان جدائی ڈالی، اللہ تعالیٰ اُس کے اور اُس کے پیاروں کے درمیان قیامت کے روز تفریق کرے گا''۔ (مشکوٰۃ حق الملوکو الفضات)

براہ کرم ان احادیث کی روشنی میں متذکرہ بالا بیان کی تصحیح فرما دیں؟

جواب: آپ کی تنبیہہ کا شکریہ۔ سوال و جواب جس شکل میں شائع ہوا ہے، اُس پر آپ کے ذہن میں اشکال کا پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ سائل نے اپنے حالات بہت تفصیل سے تحریری اور پھر زبانی بیان کیے تھے، اور اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ دلائل اور تفصیلات کے بغیر اُنھیں ایک مختصر اور قطعی جواب دیا جائے۔ اس سوال و جواب کی اشاعت قطعاً پیشِ نظر نہ تھی، لیکن کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر اُنھوں نے سوال کا ایک بے ربط سا خلاصہ اور میرا مجمل جواب اخبار میں شائع کرا دیا۔ بہرحال، اب جب شائع ہو چکا ہے اور آپ نے اس پر اعتراض وارد کر دیا ہے تو میں دوبارہ اپنے مدعا کو واضح طور پر بیان کیے دیتا ہوں۔

آپ نے جو پانچ احادیث نقل فرمائی ہیں، اُن میں سے پانچویں حدیث تو تفریقِ زوجین اور حضانتِ صغیر سے متعلق نہیں ہے۔ وہاں والدہ اور وَلد سے مراد لونڈی اور اُس کی اولاد ہے اور تفریق سے مراد بچوں کو ماں سے جدا کر کے باپ کے سپرد کرنا نہیں ہے، بلکہ والدہ اور بچوں کو الگ الگ افراد کے سپرد کرنا ہے، یا اُن کے ہاتھ بیچ دینا ہے۔ مگر متعدد احادیث سے بھی اس فعل کی ممانعت ثابت ہے۔ بقیہ پہلی چار احادیث سے درج ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:

۱- زوجین کی تفریق اور اولادِ صِغار [چھوٹی عمروں] کی موجودگی کی صورت میں اولاد اگر سنِ تمیز کو نہ پہنچی ہو اور مادرانہ شفقت کی محتاج ہو، تو والدہ اُسے اپنی حضانت (پرورش) میں رکھنے کی زیادہ حق دار ہے، بشرطیکہ وہ نکاحِ ثانی نہ کرے۔

۲- اگر اولاد سنِ تمیز کو پہنچ جائے تو ایسی صورت میں یا تو قرعہ اندازی کی جائے گی، یا پھر اگر والدین میں سے کوئی ایک یا، دونوں اس کے لیے رضامند نہ ہوں، تو بچے کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ والدین میں سے جس کے ساتھ رہنا پسند کرے، اُسی کے ساتھ ہو جائے۔

یہ اُصول جو سنتِ نبویؐ سے ثابت ہیں، اِن سے اختلاف کی کسی مسلمان کو گنجایش نہیں۔ البتہ، ائمۂ سلف نے ان اور اسی قبیل کی دوسری احادیث کے سیاق ومحل کا لحاظ رکھتے ہوئے، نیز والدین اور اولاد کے باہم دگر شرعی حقوق اور ذمہ داریوں کو من حیث المجموع نگاہ میں رکھتے ہوئے، والدہ کے حقِ حضانت کے لیے چند مزید شرائط وحدود بیان کیے ہیں، مثلاً: علماے مذاہب اربعہ کا قریب قریب اس پر اتفاق ہے کہ حسب ذیل عُیوب اگر والدہ میں ہوں درآں حالیکہ والدان سے بری ہو، تو والدہ کا حقِ حضانت ساقط ہو جائے گا:

● ارتداد ● فتورِ عقل ● ترکِ صوم وصلوٰۃ یا علانیہ فسق وفجور ● تربیتِ اولاد سے قطعی غفلت ● اولاد کو لے کر کسی ایسے ماحول میں رہنا، جہاں فسادِ اخلاق کا اندیشہ ہو، یا کسی ایسے دُور افتادہ شہر میں جا کر مقیم ہونا، جہاں والد کے لیے اولاد کی تعلیم وتربیت کی دیکھ بھال دشوار ہو۔ ● والد کے عدمِ استطاعت کے باوجود اُس سے اولاد کے نفقے کا مطالبہ کرنا۔

اسی طرح فقہا کی راے یہ بھی ہے کہ والدہ کے پاس رہنے کی مدتِ حضانت سات یا زیادہ سے زیادہ نو برس ہے۔ اس کے بعد والد کو حق حاصل ہے کہ وہ اولاد کو اپنے چارج میں لے لے۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان شرائط میں سے کوئی شرط بھی مذکورہ احادیث یا عام اصولِ شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اولاد کے نان نفقے، اُن کی مادی واخلاقی تربیت، اُن کی تعلیم، ہُنر آموزی اور اُن کے شادی بیاہ کی اصل ذمہ داری والد پر ہے، نہ کہ والدہ پر۔ مرد ہی بحیثیت قوامِ خاندان قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا [التحریم ۶۶:۶] کا اوّلین مخاطب ہے۔ ان حالات میں یہ کس طرح قرینِ قیاس ہوسکتا ہے کہ والدہ کو غیر معین مدت کے لیے علی الاطلاق

حقِ حضانت دے دیا جائے، کہ وہ والد کی خواہش کے علی الرغم جس سانچے میں چاہے اولاد کو ڈھال دے اور پھر اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے اولاد کو والد کے حوالے کردے۔

اسی بنا پر یہ کہنا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ مدتِ حضانت کو سنِ بلوغ تک لازماً طول دینا چاہیے۔ جب اولاد بالغ اور صاحبِ اختیار ہوگئی، تو اُس وقت اُس کے والد کی ولایت میں آنے کے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتے۔ اُس وقت وہ ایک طرح سے اپنے نفع وضرّر کی خود مکلف اور ذمہ دار بن جاتی ہے۔ اس لیے حکمتِ شریعت عین اس امر کی مقتضی ہے کہ ایک طرف تو مدتِ حضانت کی ایک مناسب حد متعین کی جائے، اور دوسری طرف والدہ کے حقِ حضانت پر مناسب قیود عائد کی جائیں۔ والدہ پر عدمِ نکاح اور عدمِ ارتداد کی قید خود احادیث میں آگئی ہے۔ اسی سے مزید پابندی اور تحدید کا جواز نکل سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر دوسری شرائط کا ذکر نہیں فرمایا، تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ جو مقدمات آپؐ کے سامنے پیش ہوئے اُن میں والدہ کی طرف سے اس طرح کے خدشات کے بارے میں امن واطمینان تھا ورنہ خاموش نہ رہتے، بلکہ والدہ کی حضانت کی صورت میں متوقع مضرات کو ضرور بیان کرتے اور اپنے آپ کو زیادہ حق دار ثابت کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا نہ کرتے کہ باپ سے بیٹے کے معاملے میں کون جھگڑ سکتا ہے، بلکہ ساتھ یہ بھی کہتے کہ والدہ اس کی تربیت خراب کرے گی۔ گویا کہ اِن جھگڑوں میں، والدین میں سے کسی ایک کے صالح اور دوسرے کے غیر صالح ہونے کا سرے سے سوال تھا ہی نہیں، صالحیت کے لحاظ سے والدین مساوی تھے۔

اصل تقابل صرف ماں کی مامتا یا اس کے احتیاج اور پدری محبت کے درمیان تھا۔ ایسی صورت میں ماں کو ترجیح دی گئی ہے، یقیناً اب بھی دی جائے گی۔ اس سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اگر ماں تربیتِ اولاد کی عظیم ذمہ داریاں اُٹھانے کے لیے قطعی نااہل ہو، تب بھی اُس کے حقِ حضانت کو مقدم رکھ کر اولاد اُس کے سپرد کردی جائے گی۔ (جسٹس ملک غلام علی، رسائل و مسائل، ششم، ص ۴۹۶-۵۰۱)